ژاں پال سارتر

وجودیت اور انسان دوستی

مترجم: قاضی جاوید

Mashaalbooks.org

وجودیت اور انسان دوستی

ژاں پال سارتر

ترجمہ: قاضی جاوید

مشعل
آر-بی 5 ' سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600 ' پاکستان

MashalBooks.org

حرفِ اول

معاصر فلسفیانہ تحریکوں میں سے وجودیت کے بارے میں غالباً سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی وسیع تر مقبولیت ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر اسے فکری انداز کے بجائے ادبی حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اپنی محدود ترین تشکیل میں وجودیت ایک ایسا مابعد الطبیعیاتی نظریہ ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فرد کے جوہر کا تعین اس کے وجود کے اظہار کے بعد ممکن ہے۔ یہ نظریہ فرد کی آزادی کا اعلان کرتا ہے۔

وجودی فکر کا آغاز ژاں پال سارتر سے نہیں ہوا۔ اس سے پہلے بھی فلسفہ اور مذہب میں اس فکر کے منابع موجود تھے لیکن وجودیت کی عام مقبولیت بہر طور سارتر کی مرہونِ منت ہے۔

یہاں سارتر کے شہرہ آفاق خطبے L, Existentialisme Est un Humanisme کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سارتر نے یہ خطبہ ۱۹۴۵ء میں پیرس کے ایک کلب میں دیا تھا۔ اس میں وجودیت کا دفاع انسان دوستی کے سچے نظریے کے طور پر کیا گیا ہے۔ فرانسیسی زبان میں یہ خطبہ پہلی بار ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ انگریزی میں ''وجودیت اور انسان دوستی'' کے عنوان سے اس کا ترجمہ فلپ میرٹ نے کیا جو امریکہ میں صرف ''وجودیت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو ترجمہ میرٹ کے انگریزی ترجمے پر مبنی ہے۔

اس خطبے کو وجودی ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے اور اسے خود سارتر کے

فلسفے کا سب سے مختصر اور بہترین تعارف کہا جاتا ہے جس میں اس نے وجودیت کے بنیادی تصورات کی وضاحت کرتے ہوئے فلسفیانہ اصطلاحات سے بڑی حد تک گریز کیا ہے۔

انگریزی بولنے والے دنیا میں یہ خطبہ سارتر کی مقبول ترین تصنیف ہے، جب کہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں اسے اس خطبے کے حوالے ہی سے سمجھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سارتر سے عمومی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے محض اس کا مطالعہ ہی کافی ہوگا لیکن فلسفہ کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے یہ خطبہ صرف بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔ سارتر کو سمجھنے کے لیے انہیں اس کی دیگر تصانیف کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

ایک طرف تو سارتر کے مداح اس خطبے کو فکرِ سارتر کی کلید خیال کرتے ہیں تو دوسری طرف بعض نقادوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس میں سارتر نے اس احتیاط سے کام نہیں لیا جو دوسری نگارشات میں اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

بہر طور اس خطبے میں سارتر نے وجودیت کی ایک ایسی مختصر اور جامع تعریف (وجود جوہر پر مقدم ہے) پیش کی ہے جسے اب عام طور پر قبول کرلیا گیا ہے۔

اردو ترجمے میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ لفظی ترجمہ کی بجائے مفہوم کو قابلِ فہم بنایا جائے۔

قاضی جاوید

لاہور

MashalBooks.org

دیباچہ

سارتر کی فلسفیانہ تصانیف کو جنگ عظیم دوم سے پہلے اور بعد کی دو واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کی تصانیف میںBeing and Nothingness (ہستی اور لاشیئیت) اور دوسرے دور کی تصانیف میںExistentialism and Humanism (وجودیت اور انسان دوستی) اس کے نظریات کی نمائندہ تحریریں سمجھی جاتی ہیں۔ ماضی قریب میں جنم لینے والی فلسفیانہ تحریکوں میں سے وجودیت کی تحریک کوایک عرصے تک قبول عام کا درجہ حاصل رہاہےاوراب بھی دنیا کے بہت سے مما لک میں اس کے اثرات موجود ہیں۔ وجودی مصنفین نے چونکہ زیادہ تر ادب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اس لیے ادب شناس حلقے اس تحریک سے بالخصوص واقف ہیں۔تاہم زیرنظر کتاب سارتر کی کوئی ادبی تحریر نہیں بلکہ ایک لیکچر پر مشتمل ہے جواس نے 1945ء میں پیرس کے ایک کلب میں دیا تھا۔ فلپ میرے نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا اوراس کے لیے ایک تعارف بھی تحریر کیا تھا۔ ”وجودیت اورانسان دوستی“اسی ترجمہ پرمنحصر ہے۔اس خطبے کی دوبنیادی خصوصیات ہیں:

اس خطبے میں سارتر وجودیت پر لگائے جانے والے الزامات کا جواب دیتے ہوئے اس کا دفاع انسان دوستی کے نظریہ کی حیثیت سے کرتا ہے۔

یہ خطبہ ایک طرح سے سارتر کے فلسفہ کائنات کا مختصر مگر جامع خلاصہ ہے جس میں وجودیت کے بنیادی تصورات کی وضاحت فلسفیانہ اصطلاحات سے حتی الامکان گریز کرتے ہوئے کی گئی ہے۔

MashalBooks.org

وجودیت کے تعارف میں لکھے جانے والے اکثر مضامین کی تفہیم تاریخی حوالے سے کرواتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تحریک سابقہ تصوریت اور مادیتی فلسفوں سے پیدا شدہ عمومی عدم اطمینان کے بھرپور اظہار کا نام ہے۔ اسے یورپ میں گزشتہ صدی کے دوران سائنسی ترقی کے نتیجہ میں برپا ہونے والے اس صنعتی انقلاب کے خلاف ردعمل کی ایک صورت بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس نے انسان سے اس کی انسانیت اور حریتِ فکر وعمل چھین کر اسے ایک مشین میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسی طرح اس فلسفیانہ تحریک کے ارتقاء کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے المیہ کے پس منظر میں دیکھنے کی بھی سعی کی جاتی ہے۔ اس تاریخی اپروچ کی اہمیت اور اس کی ناگزیر حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اس نوع کی کاوش کے دوران یہ پتہ نہیں چلتا کہ آخر وجودیت ہے کیا۔ چونکہ زیرنظر کتاب کے شروع میں وجودیت کی نوعیت کے بارے میں ایک تعارف مضمون پہلے سے موجود ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ اس دیباچے میں ہم وجودیت پر عمومی یا تاریخی حوالے سے بات کرنے کی بجائے قاری کو بالخصوص سارتر کی فکر سے مختصراً اردو شناس کرا دیں۔

سارتر کے فلسفہ پر کام کرنے والے ناقدین کا خیال ہے کہ اس کے پہلے اور دوسرے دور کی تصانیف مزاجاً ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں لیکن سارتر اپنے دوسرے دور میں اس فلسفے سے جو اخلاقیات اخذ کرتا ہے وہ پہلے دور کی اخلاقیات سے یقیناً قدرے مختلف ہے۔ یہاں ان اخلاقیات کی نوعیت کا احاطہ کرنا اور ان کا تنقیدی جائزہ لینا یا ان ناقدین کی رائے کا محاکمہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ ہمارے سامنے خصوصیت کے ساتھ اس کے دوسرے دور کی نمائندہ تصنیف ''وجودیت اور انسان دوستی'' ہی رہے گی اور ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اس میں سارتر وجودیت کا کیا مفہوم پیش کرتا ہے اور اس مفہوم کی بعض تصریحات کیا ہیں۔

وجودیت بنیادی طور پر قیاسی نوعیت کے فلسفوں سے بالکل مختلف ہے۔ اسے ''عمل کی تحریک'' یا ''عمل کا نظریہ'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو انسانی زندگی کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اسے عمومی طور پر ایک نوع کی اخلاقیات کا نام بھی دے دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا لیکن جب ہم سارتر کی وجودیت کے لیے اخلاقیات کی اصطلاح استعمال کرتے

MashalBooks.org

ہیں تو اس کا مفہوم روایتی اخلاقیات سے یکسر مختلف ہونا چاہیے۔ روایتی اخلاقیات انسانی فطرت یا جوہر کو ایک طے شدہ امر تسلیم کرتے ہوئے ایسے عالمگیر اصول دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اخلاقی انتخاب میں انسان کی رہنمائی کریں اور جن کے مطابق عمل کرتے ہوئے فرد خود کو اپنی فطرت کے مطابق ڈھال سکے۔

روایتی اخلاقیات کے برعکس وجودیت سرے سے کسی ''انسانی فطرت'' کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ سارتر کی وجودیت کا تو بنیادی مفروضہ ہی یہ ہے کہ ''وجود جوہر پر مقدم ہے۔'' (Existence precedes essence) یعنی ''انسان وجود پہلے رکھتا ہے، اپنے آپ کا سامنا کرتا ہے، دنیا میں ابھرتا ہے۔ اس کے بعد ہی اپنے تصور (یا جوہر) کی تشکیل کرتا ہے۔ گویا انسان کی کوئی عمومی یا پہلے سے شدہ فطرت نہیں ہے۔ کوئی ایسی بنیادی خصوصیات نہیں ہیں جن کی وساطت سے انسان کے تضمن کا احاطہ کیا جا سکے۔ لہٰذا کوئی ایسے عالمگیر اخلاقی اصول بھی نہیں ہیں جن سے اخلاقی فیصلوں میں رہنمائی لی جائے۔ اگر بات اس طرح کی ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وجودیت کے پس منظر میں اخلاقیات سے کیا مراد ہے۔

وجودیت کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں: الٰہیاتی وجودیت (Theistic Existentialism) اور دَہری وجودیت (Atheistic Existentialism)۔ سارتر دہری وجودیت کا نمائندہ فلسفی ہے۔ اگر اس کے مطابق خدا نہیں ہے تو پھر انسان کیا ہے؟ یا ہائیڈیگر کے الفاظ میں ''انسانی حقیقت'' سے کیا مراد ہے؟ سارتر کہتا ہے کہ انسان ان اشیا سے مختلف ہے جنھیں کسی خاص مقصد کے لیے آرڈر پر تیار کیا جاتا ہے۔ اس نے کاغذ تراش کی مثال دی ہے۔ کاغذ تراش کا وجود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بنائے جانے سے پہلے اس کا مقصد کاریگر کے ذہن میں موجود تھا۔ سارتر کے خیال میں ''انسانی حقیقت'' کے بارے میں اس قسم کے تصور کا ہونا خود انسانی وقار کے منافی ہے۔ انسان کوئی شے نہیں بلکہ متحرک ہستی ہے، فعلیت ہے۔ پہلے سے طے شدہ کوئی امر واقعہ نہیں۔ جب خدا ہی موجود نہیں جو ایک خلاقِ حقیقی اور الوہی کاریگر کی حیثیت سے انسان کے تصور کی پیش بینی کر سکے تو پھر پہلے سے متعین کسی مقصد حیات یا فطرتِ مسلمہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح

MashalBooks.org

سارتر اقدار کے کسی بھی ماورائی ماخذ، جوہر یا کائناتی نظام کا قائل نہیں ہے۔ انسان محض 'ہے' یا زیادہ موزوں الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی حیثیت ایک لوح سادہ کی سی ہے۔ وہ جو کچھ بھی بنتا ہے اپنے وجود میں آنے کے بعد بنتا ہے اور اس وقت بھی وہ صرف وہی کچھ ہوتا ہے جو اس نے اپنے آپ کو بنایا ہوتا ہے۔ گویا انسان وجود پہلے رکھتا ہے اور اپنی تعریف یا تشکیل بعد میں کرتا ہے۔ لہٰذا معروضی اور حقیقی اعتبار سے انسان خالص وجود ہے۔ یہ کسی حقیقت سے وابستہ نہیں بلکہ خود حقیقت ہے۔ ''انسانی حقیقت'' اپنے شئون و مظاہر کے مجموعے کا نام بھی نہیں کیوں کہ یہ سب مل کر بھی وجود کی تعریف سے قاصر ہیں۔ وجود ہمیشہ ان سے ماورا رہتا ہے۔

سارتر انسانی حقیقت کو خالص داخلیت یا شعور محض کا نام بھی دیتا ہے۔ شعور ہمیشہ کسی شے کا ہوتا ہے۔ شعور اور اس کا معروض کبھی ایک دوسرے کا عین قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ لہٰذا شعور فی نفسہ لاشے ہے جسے سارتر وجود برائے خود Being for itself کا نام دیتا ہے۔ دوسری طرف کائنات کی دیگر اشیاء میں جن کے لیے وہ وجود بذات خود Being in itself کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ جو چیز شعور یا وجود برائے خود کو وجود بذات خود سے ممتاز کرتی ہے وہ لاشیئیت ہے۔ وجود برائے خود یا شعور یا انسان کا وجود لاشیئیت کا مرہون منت ہے۔ اس وجہ سے سارتر شعور کو Insufficiency یا Incompleteness کا نام بھی دیتا ہے۔ وجود برائے خود بنیادی طور پر غیر مستقل اور حادث ہے لیکن یہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اس غیر مستقل کیفیت یا خلا کو دور کیا جائے اور باشعور رہتے ہوئے بھی یہ اپنی تکمیل کرے، وجود بذات خود بن جائے لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ وجود برائے خود اور وجود بذات خود ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اس لاحاصل کوشش کی وجہ سے سارتر انسان کو ناکام جذبے کا نام دیتا ہے۔ جب ہم اسی جذبے کو لامحدودیت تک لے جاتے ہیں تو وہ خدا بن جاتا ہے یعنی کہ ہم ایسی ہستی کا تصور بناتے ہیں جو بیک وقت وجود برائے خود اور وجود بذات خود ہو اور وہ بھی بدرجہ کمال لیکن محال یہ ہے، ناممکن ہے۔ چونکہ خدا کا تصور تضادات پر مبنی ہے اس لیے نہ صرف یہ کہ فی الواقعہ خدا موجود نہیں ہے بلکہ خدا ممکن ہی نہیں۔ انسان جب الوہیت کے پیچھے بھاگتا ہے تو اس کی قسمت میں سوائے مایوسی کے کچھ نہیں ہوتا۔

MashalBooks.org

یہ ہے مختصراً وہ پس منظر جس میں سارتر اپنا اخلاقی فلسفہ پیش کرتا ہے۔

خدا موجود نہیں۔ اس صورت میں انسان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر اور باہر کی دنیا میں کوئی ایسی شے نہیں پاتا جس پر وہ اعتماد اور بھروسہ کر سکے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا کوئی جواز نہیں۔ وجود کے جوہر پر مقدم ہوتے ہوئے کوئی شخص اپنے کسی عمل کی وضاحت کسی مخصوص اور متعین حوالے سے نہیں کر سکتا۔

دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی نوع کی جبریت کا کوئی وجود نہیں۔ انسان مکمل طور پر آزاد ہے۔ وہ اپنے مستقبل کی خود تعمیر کرتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے سارتر ''انسان کو آزاد رہنے کی سزا ملی ہے، (Man is condemned to be free) بھی کہتا ہے۔ ''سزا'' اس لیے کہ انسان نے خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا اس کے باوجود وہ آزاد ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی اقدار خود تخلیق کرنے اور اپنے معیار خود بنانے پر مجبور ہے۔ وہ اپنے ہر عمل اور فیصلے سے اقدار تخلیق کرتا ہے۔ یوں وہ اپنی تخلیق کردہ اقدار کے نتائج کا ذمہ دار بھی ٹھہرتا ہے۔ جس طرح اس کی آزادی مطلق، غیر محدود اور غیر مشروط ہے اسی طرح اس کی ذمہ داری بھی ساری کائنات کو محیط ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان خود اپنا فیصلہ کرتا ہے تو یقیناً ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص کو اپنے متعلق خود فیصلہ کرنا چاہیے لیکن اس سے ہمارا مطلب یہ بھی ہے کہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ کر کے انسان صرف اپنے لیے ہی نہیں بلکہ بیک وقت پوری نوع انسان کے لیے بھی فیصلہ کرتا ہے۔ انسان کے تمام اعمال میں سے جو وہ اپنی رضا کے مطابق اپنی تشکیل کے لیے کرتا ہے، ایک بھی تو ایسا نہیں جس سے بیک وقت انسان کی کسی ایک ایسی شبیہ کی تشکیل نہ ہوتی جس پر اس کے خیال میں ہر انسان کو پورا اترنا چاہیے۔ دو چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا دراصل منتخب شے کی اہمیت کا اقرار کرنا ہے کیونکہ ہم بدتر کے انتخاب سے بالکل قاصر ہیں۔ ہم ہمیشہ بہتر کا چناؤ کرتے ہیں اور کوئی شئے ہمارے لیے اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک تمام بنی نوع انسان کی اس میں بہتری نہ ہو............ پس ہماری ذمہ داری اس سے کہیں زیادہ ہے جو ہم نے فرض کی تھی کیونکہ یہ پوری بنی نوع انسان سے متعلق ہو جاتی ہے۔

اس بے پایاں آزادی اور ذمہ داری کو صرف موت ہی ختم کر سکتی ہے کیونکہ

موت انسان کو وجود بذات خود میں تبدیل کر دیتی ہے۔ انسان ماضی میں شامل ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لیے شعور سے عاری شئے بن جاتا ہے۔

ذمہ داری کے احساس کے ساتھ جب انسان کسی عمل کی تخلیق کا فیصلہ کرتا ہے تو گویا یوں جیسے وہ اپنے اس عمل سے ساری انسانیت کے لئے کوئی فیصلہ کر رہا ہو، کوئی قدر تخلیق کر رہا ہو، قانون سازی کر رہا ہو۔ صرف اور صرف اس قسم کی صورت حال انسانی وقار کے مطابق ہے۔ سارتر اسے Good faith کا نام دیتا ہے۔ اپنے عمل سے پوری انسانیت کے لیے اقدار کی تخلیق بہت بھاری ذمہ داری ہے جو ہر فرد اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے اور اس طرح شدید کرب سے دو چار رہتا ہے۔ وہ اکثر اپنی ذمہ داری سے بچنا چاہتا ہے، فرار حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنی ذمہ داری سے محروم ہونا چاہتا ہے اس لیے وہ اکثر اپنی ذمہ داری کو نظر انداز کر دیتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے۔ یہ Bad faith ہے۔ یوں وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے کیونکہ آزاد اور ذمہ دار ہونے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں۔

سارتر نے بجا طور پر اس الزام کی بھی تردید کی ہے کہ وجودیت بنیادی طور پر فرد کی داخلیت پر بہت زیادہ اصرار کرنے کی وجہ سے ایک قنوطی رجحان کا نام ہے:

آپ نے دیکھا کہ وجودیت کو قناعت پسندی کا فلسفہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وجودیت انسان کا تعین ہی اس کے عمل سے کرتی ہے اور انسان کی کوئی یاس انگیز تصویر پیش نہیں کرتی۔ اس سے زیادہ رجائی اور کوئی فلسفہ نہیں ہو سکتا جس نے انسان کا مقدر اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ یہ فلسفہ انسان کو عمل سے نہیں روکتا کیونکہ وجودیت تو اسے بتاتی ہے کہ اگر امید کوئی چیز ہے تو وہ اس کے عمل میں ہے۔ وہ چیز جو اسے زندگی بخشتی ہے عمل ہے۔

ترجمہ کرنا ایک مشکل فن ہے اور نہایت محنت طلب کام ہے۔ کسی کتاب کے معیاری ترجمے کے لیے اصل متن اور ترجمہ دونوں کی زبان پر مکمل عبور ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب کے مضمون اور موضوع کا گہرا فہم بھی نہایت ضروری ہے۔ قاضی جاوید ہمارے ملک کے نہایت ثقہ اور معتبر دانشور ہیں۔ فلسفیانہ مسائل پر بالعموم ان کی گرفت بہت مضبوط ہے جس کا ثبوت ان کی بہت سی تصانیف ہیں جو انہوں نے فلسفہ جدید کے

MashalBooks.org